روحِ انیس

سوال نمبر ۱ : مرثیہ کے فن سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے؟ یا
مرثیہ کے اجزائے ترکیبی سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے؟ یا
مرثیہ کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالیے؟

جواب : عربی زبان کے لفظ "رثا" کے معنی رونا اور ماتم کرنے کے ہیں۔ اسی سے مرثیہ لفظ بنا ہے۔ عرف مرثیہ مرنے والے کے اظہار غم کے لیے مخصوص ہے۔ عربی اور فارسی صنف ادب میں اس کا یہی انداز رہا۔ لیکن اردو میں اس کا ایک الگ مخصوص انداز بن گیا کیونکہ مرثیہ کے تحت واقعات کربلا کا نقشہ پیش کرتے ہوئے حضرت حسین امام کی شہادت اور ان کے اصحاب اہل بیت پر یزید کی فوج اور ابن زیادہ ملعون کی زیادتی و مصائب کو منظوم قلم بند کیا گیا۔ گزرے پانچ سو سالوں سے مرثیہ گوئی کا یہی موضوع رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی و فارسی ادب سے الگ ہٹ کر اردو ادب میں کسی شخص کی موت پر اظہار تاسف کے لیے جو نظم لکھی گئی اسے شخصی مرثیہ کا نام دیا گیا جیسے "مرثیہ عارف" وغیرہ۔

مرثیہ کی شروعات کا سہرا عام طور پر دکن کو مانا جاتا ہے۔ پہلا مرثیہ "اشرف کا" "نوسہار" کو مانا جاتا ہے۔ اس کا موضوع بھی واقعہ کربلا ہے۔ منظوم داستان کے رنگ میں یہ شہادت نامہ لکھا گیا۔ اشرف نظام شاہی سلطنت کا شاعر تھا۔ اس کا نام شیخ محمد اشرف تھا اور تخلص اشرف تھا۔ بعض محققین نے اس کا نام سید شاہ اشرف لکھا ہے، جو غلط ہے۔ اسلام کر دکن میں اردو کے مصنف نصیر الدین ہاشمی نے ان کی مثنوی "نوسہار" کا ذکر کیا ہے۔ ان کا تعلق احمد نگر سے تھا۔ واقعات کربلا کے متعلق دکنی زبان کی یہ پہلی مثنوی ہے جس میں حضرت امام حسین کے مصائب اور حالات کربلا منظوم کیے گئے ہیں۔ اس میں نو باب ہیں۔ اسی لیے اس کا "نوسہار" کا نام دیا۔ کلام نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

رو رو کے کہے یوں حسین — اب کے بچھوڑی کو ملیں

اس کے بعد جو مرثیہ دستیاب ہوا ہے وہ گولکنڈہ کے مشہور شاعر ملا وجہی کا ہے۔ وجہی قطب شاہی عہد کا ایک صاحب طرز نثر نگار بھی تھا اور باشعور مثنوی نگار اور مرثیہ گو بھی مانا گیا۔ ان اور جذباتی ہیں ویکھا کی کیفیت وجہی میں شاعرانہ ہے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

حسین کا غم کرو عزیزاں — ہر کوں سوں جزا دے عزیزاں

شمس العشاق میراں جی کی وفات پر ان کے صاحبزادے برہان الدین جانم نے جو کہ باپ کے خلیفہ بھی تھے، ان کی وفات پر شخصی مرثیہ لکھا۔

نہیں محو میں چپہ نگاہ من ہماری   اللہ مجھ عاشق اپنا تو ہماری

سلطان محمد قلی شاہ، ملا وجہی، نوری اور عبداللہ قطب شاہ وغیرہ نے بھی مرثیے لکھے

ابوالحسن تانا شاہ کا درباری شاعر مرزا نے صرف مرثیہ لکھا اور یہ ہیں۔ یہ عادل شاہ ثانی کے دور میں تھا۔ گویا کہ وہ (whole timer) مرثیہ گو تھے۔ اس نے اپنے مرثیوں میں سوز و گداز کی کیفیت بھی پیش کی اور مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کر کے اپنے قادر الکلامی کا ثبوت فراہم کیا۔

بنی کے نواسے پہ پراشاں ہیں ہم   سب امت کے آنسو پہ اشاں ہیں ہم

گولکنڈہ کے شاعر غواصی نے لفظ و بیان کی جہت سے مرثیے کے اسلوب کو صاف اور معیاری بنانے کی کوشش کی۔ لطیف اور کاظم کے یہاں بھی زبان و بیان کی یہی صفائی واضح ہے۔ گولکنڈہ کے ہی ایک اور شاعر افضل نے مرثیہ شاعری کے اسلوب کو فروغ دیا۔ اس دور میں شاہ قلی خان شاہی کو مرثیہ نگاری کی حیثیت سے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔

عادل شاہی دور کے مرثیہ نگاروں میں مقیمی کا نام بھی اہمیت کا ~~حاصل~~ حامل ہے۔ اس کے بعض مراثی دستیاب ہو چکے ہیں۔ مرثیے کی روایت کو ہاشمی، ملک خوشنود اور بعض دوسرے دکنی شاعروں نے فروغ دیا۔ دکن کی مرثیائی شاعری اردو شاعری کی ارتقائی تاریخ کے تسلسل کی ایک اہم کڑی ہے۔

شمالی ہند میں مرثیہ نگاری کے اولین نقوش ہمارے سامنے اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ زمانے میں آتے ہیں۔ شمالی ہند کی اولین مرثیہ کا نمونہ "عاشور نامہ" 1688ء ہے محمد شاہ کے عہد میں اکبر بیگ، نیرنگ، حاتم، مسکین کے ساتھ فضل علی فضلی کی "کربل کتھا" میں میں مثنوی کے نمونے ملتے ہیں۔ فضلی کی "کربل کتھا" (1732-33) کی بھی اپنی اہمیت ہے۔ اسی طرح اٹھارویں صدی میں بہت سارے مرثیہ نگار سامنے آتے ہیں۔ مرثیے کی روایت کو آگے بڑھانے والوں میں سکندر، سعادت، مجروح، سودا، میر، مصحفی وغیرہ کا شمار بھی معتبر مرثیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

سودا نے مرثیہ کو سب سے پہلے "مسدس" کے فارم میں لکھا۔ اس کے بعد عام طور پر ~~مسدس~~ مسدس کے فارم میں ہی مرثیہ لکھا جانے لگا۔ ساتھ ہی یہ سودا پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مرثیہ کو صرف رونا رلانا اور آہ و بکا تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اس کو آگے بڑھایا۔ اس کو فنی اور ادبی حیثیت دلایا۔ میر کے کلیات میں بھی مرثیوں کی اچھی تعداد ہے۔ لکھنؤ میں میر خلیق پہلا شاعر نظر آتے ہیں۔

BA Part II
Hon's paper - III
Book - 4

روحِ انیس

جنہوں نے مرثیہ گوئی میں کمال حاصل کی۔ ان کے مرثیوں کی زبان صاف اور پاکیزہ ہے۔ ان کے مرثیوں میں سوز و گداز اور درد و اثر ہے۔

مرثیہ کے لیے سرزمین اودھ کافی زرخیز ثابت ہوئی اور وہاں کے حکمرانوں نے اس کو آگے بڑھانے میں کلیدی رول ادا کیا۔ ضمیر، دلگیر، فصیح وغیرہ کی بھی اپنی اہمیت ہے۔ ضمیر نے مرثیہ نگاری کے اصول مرتب کیے اور اس کی ہیئت کا تعین کیا۔ مرثیے کے ہیئت سے اجزائے ترکیبی کی ایجاد اور ان کی ترتیب ضمیر ہی کی مرہونِ منت ہے۔ انہوں نے مرثیے میں سراپے اور رزمیے لکھنے شروع کئے۔ ان کی زبان سادہ و صاف ہے۔ ضمیر، دلگیر، فصیح اور خلیق کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اردو کے عظیم مرثیہ گو شعرا یعنی میر انیس اور مرزا دبیر کے لیے راہیں ہموار کیں۔

اردو مرثیہ نگاری کا روشن باب انیس و دبیر کے عہد میں دکھائی دیتا ہے۔ ان دونوں نے اسے بام عروج پر پہنچایا اور اس کی شہرت ملک کے دور دراز تک پھیلی۔ انیس کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ ان کو واقعہ نگاری پر کمال حاصل تھا۔ انیس کی سب سے بڑی خوبی ان کی قادر الکلامی ہے۔ اردو کے دوسرے عظیم مرثیہ نگار دبیر ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی تشبیہات و استعارات کا استعمال ہے۔

ان کے بعد رشید، وحید، تعشق، شاد عظیم آبادی، عارف لکھنوی اور شمیم وری کے مرثیے بھی ملتے ہیں۔ شاد عظیم آبادی نے مرثیہ میں تصوف کو داخل کیا۔ ساتھ ہی جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری، نجم آفندی، ہلال نقوی، ہلال رضوی نے بھی مرثیے لکھے۔ جوش نے اپنے منفرد انداز دیا۔ اس کے بعد یہ صنف تو بیا ختم ہو چکی ہے۔ اس سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرزمین لکھنؤ کی فضا مرثیہ کو کافی راس آئی۔ ویسے راز عظیم آبادی اور راحتی رضوی نے بھی مرثیہ لکھے۔

شخصی مرثیہ میں غالب کا عارف کے موت پر لکھا گیا مرثیہ، مومن کا محبوبہ کی وفات پر لکھا گیا مرثیہ، حالی کا غالب پر لکھا گیا مرثیہ اور اقبال کا داغ پر لکھا گیا مرثیہ کافی مشہور ہوا۔

مرثیے کے اجزائے ترکیبی مندرجہ ذیل ہیں:

روحِ انیس

1۔ چہرہ: اس میں اپنی شاعری کی تعریف، حمد، منقبت، مناجات، صبح کا منظر، رات، آسمان، دنیا کی بے ثباتی وغیرہ تمہید کے طور پر بیان کئے جاتے ہیں۔

2۔ سراپا: اس میں ہیرو کے قد و قامت، خط و خال اور اس کی خوبیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

3۔ رخصت: اس میں ہیرو کا خود امام حسین سے جنگ کی اجازت لے کر تمام عزیزوں سے رخصت ہونے کا بیان ہوتا ہے۔

4۔ آمد: آمد میں ہیرو کا گھوڑے پر سوار ہو کر شان و شوکت کے ساتھ میدانِ جنگ میں جانے کا ذکر بیان کیا جاتا ہے۔ آمد کے سلسلے میں گھوڑے کی تعریف بھی کی جاتی ہے۔

5۔ رجز: رجز میں ہیرو کی زبان اس کے حسب و نسب کی تعریف بھی کی جاتی ہے۔ اور فنِ سپاہ گری و قابلیت کا اظہار کیا جاتا ہے۔

6۔ جنگ: جنگ میں ہیرو کا دشمن کی فوج کے بڑے سپہ سالار سے لڑنا اور اس کی بہادری کا ذکر کیا جاتا ہے۔

7۔ شہادت: شہادت میں دشمن کے ہاتھوں ہیرو کے شہید ہونے کا ذکر کیا جاتا ہے۔

8۔ بین: بین میں ہیرو کی لاش پر عزیزوں اور عورتوں کا رونا اور ماتم کرنا نظم کیا جاتا ہے۔

سوال نمبر 2: انیس کی شاعرانہ عظمت سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجئے؟ یا
انیس کی شخصیت سے اپنی واقفیت کا اظہار کریں؟ یا
انیس کی مرثیہ نگاری کا تنقیدی جائزہ لیجئے؟ یا
"روحِ انیس" کی روشنی میں کلامِ انیس پر تبصرہ کیجئے؟

جواب: نام میر ببر علی تھا اور تخلص انیس۔ ان کے والد کا نام میر خلیق تھا۔ ان کی پیدائش 1802ء محلہ گلاب باڑی فیض آباد اتر پردیش میں ہوئی اور وفات ۱۰ دسمبر 1874ء کو ہوئی۔ ان کے والد میر خلیق کا شمار اچھے مرثیہ نگاروں میں ہوتا ہے اور ان کے دادا میر حسن کی مثنوی تو کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ اس کا احساس خود میر انیس کو ہے۔ [illegible]

روح انیس

پانچویں پشت سے شاعری ورثے میں

انیس کی ابتدائی تعلیم مولوی حیدر علی کے ہاتھوں ہوئی۔ شاعری میں والد سے اصلاح لیتے تھے۔ مولوی میر نجف علی فیض آبادی اور مفتی محمد عباس سے بھی فیض حاصل کیا۔ اس زمانے کے رواج اور امیروں کے لڑکوں کے رسم کے مطابق انہوں نے گھڑ سواری، تیر اندازی اور فوجی تربیت بھی حاصل کی۔ ان کے ادبی زندگی کی شروعات تقریباً بارہ سال کی عمر میں غزل لکھنے سے ہوئی۔ پھر والد کے مشورہ پر سلام لکھنا شروع کیا۔ رباعیاں بھی کہیں پھر مرثیے کے جانب متوجہ ہوئے۔ شروع میں حزیں تخلص رکھا بعد میں ناسخ کے کہنے پر انیس تخلص رکھا۔

اردو نظم رزمیہ بیان سے خالی نہیں تھی۔ یہاں والمیکی کی "مہابھارت" "رامائن" اور فردوسی کی "شاہنامہ" جیسی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کمی کو انیس نے اپنے مرثیہ کے ذریعہ پورا کر دیا۔ ان کا تقابل مقابلہ فردوسی، ہومر، شیکسپیئر، تلسی داس اور والمیکی جیسے عالمی شعراء سے کرتے ہیں۔ ان کے ہی زمانے میں دبیر بھی ایک اعلیٰ پائے کے مرثیہ نگار ہوئے ہیں۔ ان دونوں کی چشمکیں چلتی رہتی تھیں جس کی وجہ سے اس فن کو اور جلا ملی اور اس کی قدر و قیمت بھی بڑھتی گئی۔

انیس کو زبان پر زبردست قدرت حاصل تھی۔ گویا کہ زبان ان کی لونڈی تھی۔ فصاحت اور بلاغت بھی ان کے یہاں نمایاں ہے۔ مشکل مضامین کو بھی آسان لفظوں سے رنگین کرنے کا ہنر ان کے پاس تھا۔

جنگ آزادی کی ناکامی اور لکھنؤ کی بربادی نے انہیں عظیم آباد، بنارس، حیدرآباد، الہ آباد وغیرہ میں جا کر کلام سنانے کا موقع دیا۔ انیس کسی دربار سے منسلک نہیں تھے۔ اس لئے ان کی شاعری میں درباری خوشامدانہ ذرا بھی نہیں آ پاتی۔

ان کے کلام کو پانچ جلدوں میں نول کشور پریس نے شائع کیا اور نظامی پریس نے بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے لحاظ سے کلام کو تین حصوں میں شائع کیا۔ پاکستان سے ان کا کلام چار جلدوں میں 1958ء میں شائع ہوا۔ ان کے مرثیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے عابد علی عابد فرماتے ہیں:
"انیس کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہر صنف کے رمز سے فائدہ اٹھا کر مرثیے کو

عروجِ انیس

ایک ایسی چیز بنا دیا جس میں مثنوی، قصیدہ، غزل، ڈرامہ، داستان
سب ہی چیزوں کا رنگ جھلکتا ہے اور اس کے باوجود اس صنفِ سخن کی
انفرادیت قائم رہتی ہے۔

انیس نے فن کو بامِ عروج پر پہنچایا اور اس کی شہرت
ملک کے دور دراز تک پھیلی۔ انیس کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔
ان کو واقعہ نگاری پر کمال حاصل ہے۔ انسانی جذبات، اعمال، خصوصاً جنگ
و نزاع نہایت جوش و صفائی سے بیان کرتے ہیں۔ لیکن کوئی شے مبہم و نامکمل
نہیں رہتی۔ وہ کسی واقعہ کے وقت ان جزئیات کا بیان کرتے ہیں جس سے
پورا واقعہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔

انیس کی سب سے بڑی خوبی ان کی قادر الکلامی ہے۔ نازک خیالات
لطیف جذبات اور مشکل مضامین کو سیدھے سادے الفاظ میں برجستگی اور بے تکلفی سے بیان کرتے ہیں۔ سننے والے
کے دل و دماغ پر جو اثر پیدا کرنا چاہتے ہیں اس میں کامیاب رہتے ہیں۔ زبان و بیان کے معاملہ میں تو انیس کا مقابلہ
کوئی دوسرا شاعر کر ہی نہیں سکتا ہے۔ ان کے کلام میں جو سلاست، روانی، فصاحت، بلاغت اور شگفتگی ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔

"روحِ انیس" میں سید مسعود حسین رضوی لکھتے ہیں:۔
"انیس جب دو شخصوں کی گفتگو لکھتے ہیں تو الفاظ، طرزِ کلام، لب و لہجے میں متکلم اور مخاطب دونوں کی عمر، صنف
سیرت، حیثیت، وقتی قلبی کیفیت، گفتگو کے موقع اور ان کے باہمی تعلقات کا لحاظ رکھتے ہیں۔
انیس کی کردار نگاری پر کلیم الدین احمد لکھتے ہیں "سیرت نگاری تو اردو شعراء میں سراسر مفقود ہے۔ انیس کے مراثی میں
بھی اس کا وجود نہیں۔ وہ ہر فرد کی شخصیت کو الگ الگ واضح نہیں کرتے سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے نظر
آتے ہیں۔ ہر فرد میں وہی خوبیاں پائی جاتی ہیں جو دوسروں میں ہیں۔"

مناظرِ قدرت کے بیان میں انیس کو یہ طول حاصل ہے، دریا، جنگل، صبح، شام، دوپہر وغیرہ
کا سماں انیس ایسا کھینچتے ہیں کہ مصور کا قلم بھی ایسی کیفیت اور نمونہ پیش کرنے سے عاری ہے۔

انیس کا کلام جتنا فصیح ہے اتنا بلیغ بھی ہے۔ سلاست و استقلال، سادگی و
رنگینی، طول و اختصار، بلاغت میں آتے ہیں۔ انیس کے کلام میں بلاغت کے تمام لوازم موجود ہیں۔ گفتگو اور
مکالمہ کے لکھنے میں بھی کوئی شاعر انیس کا مقابل نہیں ہو سکتا۔ انیس جب دو شخصوں کی گفتگو لکھتے ہیں
تو الفاظ، طرزِ کلام، لب و لہجے میں متکلم اور مخاطب دونوں کی عمر، صنف، سیرت، حیثیت،
گفتگو کے موقع اور ان کے باہمی تعلقات کا لحاظ رکھتے ہیں۔

مقامِ رخ آخری ہے یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا